© rasailojaraid.com


بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

زیر دستوں پر زبردستوں کے ظلم و استبداد کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ مدنی الطبع انسان کی زندگی۔ ظلم و عدوان کے ہتھیار بلاشبہ وقت کے تقاضوں کے تحت مختلف سانچوں میں ڈھلتے رہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ انسانی کے چند مختصر ادوار کو چھوڑ کر جن میں انسانوں کی سیادت و قیادت خدا شناس اور خود شناس لوگوں کے ہاتھوں میں رہی دنیا کے ہر طاقتور گروہ نے کمزوروں پر مظالم ڈھائے۔ وہ لوگ جنہیں قدرت نے مادی وسائل سے مالا مال کیا تھا، علم و حکمت کے بیش بہا خزانے اُن کے ہاتھ میں دیئے تھے اور قوت و حکومت سے سرفراز فرما کر انہیں سربلندی عطا کی تھی۔ انہوں نے بدقسمتی سے انسانوں کی دستگیری کرنے اور انسانوں پر انسانوں کے ظلم و ستم کو روکنے کی بجائے کبر و نخوت سے سرشار ہو کر نوع انسانی پر دستِ استبداد دراز کرنا شروع کیا۔ وہ انسانیت کے لیے خیر و فلاح کا ذریعہ بننے بلکہ اس کے برعکس خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیو ثابت ہوئے۔ ملوکیت اور استعمار کے نشہ نے انہیں اتنا بدمست کر رکھا تھا کہ وہ اپنے سارے فرائض بھول گئے اور دنیا کے کمزور اور محتاج انسانوں کو اپنی اور اپنے مخصوص گروہ کی ہوسناکی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

---

تاریخ کی انسانیت کے خلاف یہ شہادت خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر ہے یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت۔ ممکن ہے ہم انسانوں کے بعض ظالمانہ اعمال کی کوئی تسلی بخش توجیہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بعض کو دلائل سے جھٹلا بھی سکیں مگر انسان کے ہاتھوں انسانیت کی بربادی کی اس لمبی اور دلفگار داستان کو جو لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں واقعات سے عبارت ہے اور جس کے بعض ابواب بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے لکھے گئے ہیں اور اُن کی سیاہی بھی خشک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہونے پائی، اُسے آخر ایک حقیقت پسند انسان مکمل طور پر کس طرح رد کر سکتا ہے، البتہ جو چیز تسلیم کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ زبردست آزاری کی صورتیں حالات کے مطابق مسلسل بدلتی رہیں۔

---

اس مقام پر پہنچ کر ایک شخص کے ذہن میں بالکل قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانیت کا خمیر ہی شر و فساد اور ظلم و استبداد سے اٹھایا گیا ہے اور بیچارا انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے دوسرے انسانوں پر دست درازی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پاتا ہے؟ جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو اس کا جواب نفی میں پاتے ہیں۔ اگر یہ ظلم و زیادتی انسانی فطرت کا جزوِ اعظم ہوتی تو انسانیت اس کے تدارک کے لیے کبھی بھی اتنی بے چین اور فکرمند نہ ہوتی جتنی کہ وہ ہمیشہ سے رہی ہے۔ تاریخِ انسانی میں ہمیں بلاشبہ جارحانہ اقدام کے لاتعداد روح فرسا واقعات نظر آتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ ہماری نگاہیں اُن مخلصانہ کوششوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتیں جو انہیں روکنے کے لیے وقتاً فوقتاً کی جاتی رہی ہیں۔ یہ مختلف دفاعی تدابیر، یہ بین الاقوامی معاہدات، اور قیامِ امن کے لیے یہ بے شمار تنظیمیں آخر انسان کی کس خواہش کا مظہر ہیں۔ ان سب کے پیچھے جو جذبہ کام کرتا ہے وہ یہی تو ہے کہ دنیا سے کسی طرح ظلم و فساد مٹے اور انسان ایک بہتر اور پُرامن زندگی بسر کرنے کے قابل ہو۔

---

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ اگر یہ زبردست آزاری انسانی فطرت کا لازمی جزو نہیں تو پھر یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟

جب ہم انسان کی خلقت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات نے انسان کو ایک ایسا دلِ بیتاب دیا ہے جو اُس کی زندگی میں حرکت اور قوت پیدا کرتا ہے۔ جس کے طفیل اُس کے اندر نئی نئی خواہشات کی تخلیق ہوتی ہے اور اس طرح وہ اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرنے کے لیے ہر آن کوشاں رہتا ہے۔ اسی سے سارے تخیلات و تعقبات متنفیر ہوتے ہیں۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"تب و تاب جاودانی" ہی زندگی کی اصل علامت ہے۔ یہ زندگی کے نظم و ربط کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسی نقطہ کے گرد انسانی شخصیت اپنا استحکام و تحقق کرتی ہے اور اسی کے بل بوتے پر وہ اپنے نمو اور بقا کے لیے عمل کے بے پایاں امکانات تلاش کرتی ہے۔ یہ انسان کو کسی منزل پر بھی سکون و آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی بلکہ ہر منزل پر اُسے نئی نئی منزلوں تک پہنچنے کے لیے سرگرم عمل رکھتی ہے۔

جب ہم اس "پُراسرار شے" کے عمل کو دیکھتے ہیں تو اسے کسی طرح بھی انسانیت کے حق میں ضرر رساں نہیں پاتے بلکہ اسے ہر لحاظ سے نوعِ بشری کے لیے مفید اور کارآمد سمجھتے ہیں۔ اسی کی بدولت ہمارے اندر عمل کی خواہش، کچھ ہونے کی تمنا اور اپنی خداداد قوتوں اور صلاحیتوں کو ایک راہ پر ڈالنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہم سب جمادات کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہیں۔

---

مگر اسے انسانیت کی بدبختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ شیطان اور اس کی ذریت نے عمل کے اس سب سے بڑے محرک کو بھی غلط راہوں پر ڈال کر اس سے انسانیت کو شدید نقصان پہنچانے کا سامان فراہم کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انسان کا دلِ بیتاب اس کائنات کے وسیع و پیچیدہ طلسم کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ نظامِ تکوینی کے پرے اس حقیقتِ کبریٰ کا بھی کھوج لگاتا جس کے بغیر اُس کا وجود ہستی کی وسعتوں میں بے معنی سا ہے اور پھر اس غیر محدود اور لامتناہی ذات کے ساتھ اپنا رشتۂ عبودیت استوار کر کے اس کے دیئے ہوئے ضابطوں کی پابندی کرتا۔ لیکن افسوس کہ یہ ناصبور دل مادّی زندگی کے طلسمِ ہوش ربا میں ایسا گرفتار ہوا کہ اس کے باہر وہ کسی چیز کو پا نہ سکا۔ اس آئینہ خانہ میں اُسے ہر پھر کر اپنی ہی ذات نظر آئی اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ یہ ساری کائنات اسی کے لیے پیدا کی گئی ہے، وہ بالکل غیر مسئول ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اُس کے ذریعہ فطرت کے ازلی و ابدی پروگرام کی تکمیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی اس بے قراری نے ان غلط اثرات کے تحت آکر اور ان گمراہ کن احساسات کی آغوش میں پل کر ہوسناکی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور "تگ و تاز" جو دل کی ناصبوری کا فطری نتیجہ ہے، زبردست آزاری کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شکل میں رونما ہوئی ہے۔ استعماریت کی زہرہ گداز داستان پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ کیا یہ ہوس کی در حقیقت اس "تب و تاب جاودانی" کی ایک مسخ شدہ صورت تو نہیں ہے۔

ان ابتدائی گذارشات کے بعد اب ہم جوع الارض ہی کی مختلف صورتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

---

اس سلسلہ کا آغاز ہم اُس دور سے کرتے ہیں کہ جب بادشاہ اور فرمانروا محض اپنی طاقت اور قوت کا لوہا منوانے کے لیے کمزور ممالک پر حملہ کیا کرتے تھے۔ آخر سوچیے کہ وہ کونسی ایسی چیز تھی جو انہیں اپنی سلطنت اور بادشاہت کے حدود سے نکال کر آس پاس کی اقوام کو تاخت و تاراج کرنے پر ابھارتی تھی۔ کیا افلاس انہیں اپنے گھر کو خیر باد کہنے اور دوسروں کے گھر میں جاگزیں ہونے پر مجبور کرتا، کیا ملک کی تنگ دامانی انہیں اس بات پر آمادہ کرتی کہ وہ اس کی حدود کو وسیع کریں۔ اگر ملک کی غربت ہی اُن کی ان مہمات کا بنیادی محرک ہوتی تو تاریخ ایک بالکل دوسرا رُخ اختیار کرتی۔ پھر جابرانہ اقدام دنیا کی مفلس اور نادار قوموں کی طرف سے کیا جاتا۔ پھر بے سروسامانی کسی قوم کی قوت کا واحد سامان ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں ایسا نہیں ہوا بلکہ دنیا کے طاقتور گروہوں نے ہی کمزور انسانوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے تیار کیے۔

اس کے علاوہ اگر اس لشکر کشی کا واحد مقصد اپنی قوم سے مفلسی کو دُور کرنا تھا تو ان مہمات کو سر کرنے کے بعد قوم کی معاشی سطح بلند کرنے کی سرتوڑ کوششیں کی جاتیں۔ لیکن تاریخ کے اوراق اس کے بالکل برعکس شہادت دیتے ہیں۔ فتح اور کامرانیوں نے ان فاتحین کے دماغ کو بالکل بگاڑ دیا۔ ایک طرف سلطنتوں پر سلطنتیں سرنگوں ہوتیں اور دوسری طرف ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔ یہ ظالم اور سفاک انسان غیروں کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنی قوم کے لیے بھی ظلم و جبر کے مجسمے تھے۔ وہ جن عوام کی ہمدردی کا بہانہ بنا کر انہیں دوسرے انسانوں کے خلاف ٹکرانے پر آمادہ کرتے، انہی کا خون چوستے اور اس سے اپنے شبستانِ عیش کے چراغ جلاتے۔ اپنے ملک کے لوگوں سے انہیں کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ یہ لوگ اپنی ذات میں خدا بنے بیٹھے تھے اور سمجھتے تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ دنیا کی ہر ذی روح بلبلے رُوح چیز اُن کی خواہش کے احترام میں قربان کی جاسکتی ہے۔

---

آج ہم جب ان بادشاہوں کے مظالم کے تذکرے پڑھتے ہیں تو ہمارا خون کھولنے لگتا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں نے واقعی بڑی ہی انسانیت سوز حرکات کی تھیں جن پر ہم سب کو نفرین بھیجنی چاہیے۔

یہ سفاک بلاشبہ ہر قسم کی لعنت کے مستحق ہیں لیکن دیکھیے کہ ان کی یہ ظالمانہ حرکات انسانیت کے لیے بحیثیت مجموعی کہاں تک نقصان دہ تھیں۔

جب ہم ان لوگوں کے دائرۂ کار کا جائزہ لیتے ہیں تو اسے نہایت ہی محدود پاتے ہیں۔ ان شہنشاہوں کا "احساس انا" جس وقت شیطان کے نرغے میں آتا تو یہ سر پھرے ایک لشکر لیکر دوسری قوموں پر حملہ آور ہوتے۔ وہ سلطنتیں جو خراج دینے پر آمادہ ہو جاتیں اُن کو چھوڑ دیا جاتا اور وہ بادشاہ جو جنگ کے بغیر شکست ماننے پر آمادہ نہ ہوتے اُن کے حق میں قاضی شمشیر فیصلہ کرتا۔ اس رزم آرائی کے بعد اگر مناسب معلوم ہوتا تو شاہی خاندان اور فوج کے کچھ آدمی قتل یا قید کر لیے جاتے۔ ملکی خزانے میں اگر دولت ہوتی تو وہ چھین جاتی، اگر ملک کی کوئی حسینہ نگاہوں میں جچتی تو وہ اپنے حرم میں داخل کر لی جاتی۔ واپس جاتے ہوئے فاتح بادشاہ اپنی سواری کے ساتھ چند قیدی شہزادے باندھ لیتا تاکہ رعایا کو معلوم ہو جائے کہ حضور مہمات سے کامیاب و کامران آئے ہیں۔ اس سے زیادہ ان فتوحات کا نہ کوئی مطلب تھا اور نہ ہی مقصد۔ زندگی کی جوئے نرم رو میں کسی قسم کا کوئی تلاطم نہ پیدا ہونے پاتا نہ تو لوگوں کے انداز زیست بدلتے اور نہ ہی اُن کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں کوئی فرق واقع ہوتا۔ وہ اپنی زندگی کو اُسی نہج پر گزارتے چلے جاتے جو انہیں اپنے لیے پسند ہوتی۔ ان لڑائیوں میں فرماں روا تو بلاشبہ تبدیل ہوتے مگر زندگی کے انفرادی اور اجتماعی ڈھانچوں میں قطعاً کوئی تبدیلی واقع نہ ہونے پاتی۔

ان حالات میں دیکھیے کہ جب کسی شخص کے ذہن پر ہوسناکی کا بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ زندگی کے کتنے حصے کو متاثر کرتا ہے۔ اگر بربادی کا مبالغہ آمیز اندازہ بھی کیا جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ قوت و طاقت کے اس مظاہرہ میں چند سو نہ سہی، چند ہزار جانیں تلف ہوئیں کچھ سونا اور چاندی لٹا، دو چار عورتیں اغوا ہوئیں اور چند شہزادے قید ہوئے۔ لیکن اس میں نہ تو نظامِ تعلیم بدلا، نہ ہی نظامِ اخلاق زیر زبر ہوا، نہ ہی نظامِ معاشرت کو تہ و بالا کیا گیا۔ ان ریشہ دوانیوں کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ صرف محلات تک ہی محدود تھے۔

---

صنعتی انقلاب کے بعد اقتدار کے اس فتنہ نے بالکل ایک دوسری صورت اختیار کی۔

عقلی ترقی نے جو مغربی دنیا کے نزدیک دراصل مادّی ترقی ہی کا دوسرا نام ہے اُن سب رشتوں کو جنہیں قدیم مسیحی تہذیب نے ایک مرکزِ کائنات یعنی ذاتِ الٰہی سے وابستہ کر رکھا تھا، یکسر توڑ دیا۔ خالقِ کائنات کی پرستش کی جگہ اب سرمایہ سمجھنے لگا اور آدمی کے لیے خدا کی رضا جوئی کی بجائے خود اُس کی زندگی، خود اپنا آرام و آسائش مقصود بالذات بن گیا۔ دوسری دنیا کے ادھار پر انسان اس دنیا کے نقد کو ترجیح دینے لگا۔

یہ ایک ایسا زبردست زلزلہ تھا جس نے یورپ کی زندگی کے سارے اجزا کو تتر بتر کر دیا اور اس سے سیاسی زندگی میں، اجتماعی زندگی میں، ذہنی زندگی میں ایک انتشار رونما ہوا۔ تمدن کے اجزاء بکھرنے لگے، ریاست الگ ہوئی، علوم و فنون الگ، دین الگ، دنیا الگ، مذہب الگ، معیشت الگ۔ ان میں سے ہر چیز جدا اور بجائے خود مقصود بالذات بن گئی۔ تنوعاتِ عالم پر الگ الگ نظر پڑنے لگی کسی کل میں اُن کے ربط کی تلاش نہ رہی۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوعِ انسانی کا شیرازہ جو مذہب کی مقناطیسی قوت نے باندھ رکھا تھا، وہ بہت جلد منتشر ہو گیا اور اس کے بعد خود غرضانہ افادیت نے اسے پھر سے ایک نئی سلک میں منسلک کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ جدید سائنس بھی انفرادیت کو غیر معمولی حد تک ابھارنے میں ایک بہت بڑا ذریعہ بنی۔ سائنس کا مطمع نظر یہ ہے کہ اس کے نتائج سب کے لیے ہوں۔ اس کے مخاطب جمہور ہیں اس لیے جب سائنس کو ترقی ہوئی تو ایک فرد بحیثیت فرد کے سوسائٹی میں اتنا اہم خیال کیا جانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگا کہ اس کی ذات کے لیے پورے سماج کو تباہ کیا جا سکتا تھا۔

فکر و نظر کی اس بنیادی تبدیلی سے قوت و طاقت کا وہ سرچشمہ جسے "حاکمیت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور جو صدیوں سے بادشاہوں کے تسلط میں چلا آ رہا تھا اُس کا قبضہ و اختیار اب عوام کے ہاتھوں میں منتقل ہوا اور اس کے نتیجے میں حاکمیتِ جمہور کا نظریہ بڑی تیزی کے ساتھ یورپ کے ہر ملک میں پھیلنے لگا۔

---

اہلِ یورپ اگر مادہ پرست ہونے کی بجائے خدا پرست ہوتے تو انفرادیت کا اُبھرتا ہوا یہ احساس اور فرد کی قوت و طاقت کا یہ نظریہ خواہ بالکل درست نہ سہی مگر انسانیت کے لیے اتنا مہلک نہ ثابت ہوتا جتنا کہ اس وقت ہوا ہے۔ مگر یہ وقت انسانیت کے لیے نہایت پُرآشوب تھا کہ ایک طرف تو قوت و طاقت کا منبع و مبدأ عوام کے ہاتھ آگیا اور دوسری طرف حاکمیت کے یہ محافظ و پاسبان بڑی ہی ذلت کے ساتھ مادیت کے بت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔

---

دنیوی فوائد و لذائذ کی بڑھتی ہوئی ہوس اس امر کی متقاضی تھی کہ عوام کسی ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل کریں جس کی قوت و طاقت کی مدد سے وہ اپنے مادی مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوں۔ اس لیے انہوں نے معاہدہ عمرانی کے تحت اپنے ملک اور قوم کو حاکمیت کے حقوق تفویض کرنے شروع کیے۔ چنانچہ اس دور میں پورے یورپ میں مختلف مملکتیں اور اقوام زبردست قوت اور طاقت کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ ایک خدا پرست انسان اپنی زندگی میں جو حیثیت اپنے مالک اور خالق کو دیتا ہے وہی حیثیت اب ان سلطنتوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ یہ جدید ریاستیں ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے یکسر آزاد ہیں کیونکہ ان سے بالاتر کوئی قوت تسلیم نہیں کی جاتی جس کے یہ تابع ہوں، بلکہ دنیا کی ہر چیز ان کے مفاد کے تابع ہے۔ پھر یہ اپنے تئیں ہمہ گیر خیال کرتی ہیں اور اس بات کی دعویدار ہیں کہ فرد ان کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالے اور اپنی تمام خواہشوں کو ان کی مشیت کی قربان گاہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر بھینٹ چڑھا دے۔ اُس کی حیات و ممات انہی کی خاطر ہو، مانگے تو انہی سے مانگے اور جھکے تو انہی کے آگے جھکے۔ کیونکہ یہ نہ صرف عوام کی مرضی کی ترجمان ہیں بلکہ ان کی حاکمیت کا مظہر بھی ہیں۔

---

ان "تازہ خداؤں" کو جب قوت و طاقت کے نشہ نے بے چین کیا اور انہوں نے اپنی توسیع کا سامان مہیا کرنا چاہا تو کمزور قوموں پر ایک عجیب و غریب قسم کی مصیبت نازل ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نازل نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ نیا استعمار صرف محلات پر ہی حملہ آور نہیں ہوتا بلکہ ہر گھر، ہر خاندان، اور ہر محلہ کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے جد و جہد کرتا ہے۔ پہلے بادشاہ اپنا تفوق و برتری ثابت کرنے کے لیے صرف شہزادوں کو قید کرتے، فوج کے بڑے بڑے افسروں کو موت کے گھاٹ اتارتے اور بیگمات کو اٹھا کر لے جاتے مگر جدید استعمار نے اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے مظلوم اقوام کی معیشت کو تباہ کرنا شروع کیا۔

---

اس استعمار کا دائرہ اثر پہلے استعمار سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے محلات کا رُخ کرنے کی بجائے منڈیوں کا رُخ کیا اور اس امر کی پوری کوشش کی کہ کسی طرح ان پر اس کا پورا تسلط قائم ہو جائے۔ کیونکہ اسے علم تھا کہ اس دور میں قوم کی قسمت کا فیصلہ سرمایہ کے ہاتھ میں ہے اور جو قوم اس معاملہ میں دوسری پر سبقت لے جائے گی وہی دنیا میں سب سے بڑی اور حکمران قوت ہو گی۔

لیکن اس ضمن میں یہ یاد رہے کہ سرمایہ کا حصول بذاتِ خود ان قوموں کا مقصد نہ تھا بلکہ مقصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ۔ ان اقوام کا حقیقی مقصد صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ قوت و اقتدار حاصل کریں اور چونکہ عہد جدید میں اس کو حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ صرف یہی ایک تھا اس لیے انہوں نے اس راہ میں زبردست کوششیں کیں۔

---

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے مادہ پرست انسان کی محض ناتجربہ کاری سمجھیے کہ اس نے استعمار کا دائرہ کار تو یقیناً وسیع تر کیا مگر اسے کامیاب بنانے کے لیے کوئی نئے نئے طریقے ایجاد نہ کیے۔ پرانے شہنشاہوں کی طرح ہی پہلے کمزور اقوام کو تاکا جاتا اور پھر اُن پر فوج کشی کے ذریعہ اُن کی سیاسی قوت و طاقت درہم برہم کر دی جاتی۔ البتہ اس نئے استعمار نے جب مختلف ممالک کو سرنگوں کیا تو پھر ایسی تدابیر بھی اختیار کیں کہ ان ممالک کی دولت و ثروت اُس کے خزانوں میں اپنے آپ منتقل ہوتی رہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی پوری طرح انتظام کیا گیا کہ محکوم قوموں کے اندر سیاسی شعور بیدار نہ ہونے پائے تاکہ استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو چاٹتی رہے اور ان بدنصیبوں کو خبر تک نہ ہو۔

---

دنیا کی کسی قوم کو سیاسی اور معاشی غلامی پر قانع کر لینا کوئی آسان اور سہل کام نہیں۔ اس کے لیے اگر ایک طرف بم برسا کر اس قوم کو کمزور کیا جاتا ہے تو دوسری طرف حیلوں اور چالبازیوں سے بھی اُس کی قوتِ مدافعت کو ختم کرنے کی لاتعداد اسکیمیں تیار ہوتی ہیں۔ کسی قوم کے اموال پر ایک غیر معین مدت تک دست درازی صرف اُسی شکل میں کی جا سکتی ہے جبکہ وہ قوم اپنی اس تباہی پر خود راضی ہو جائے۔ اتنی بے بس ہو کہ اس ظلم اور زیادتی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتی چلی جائے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے غلام قوموں کے اندر تفرقہ ڈال کر انہیں خوں ریزی اور برادر کشی میں اس طرح مصروف رکھا جاتا ہے کہ ان کے اندر باہر کے استعمار کے خلاف صف آرا ہونے کی سکت اور طاقت بھی باقی نہیں رہتی۔

---

استعمار کی یہ شکل ایسی ہے کہ یہ دنیا کے کسی حصہ میں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ جذبۂ قومیت کا جو جذبہ ظالم قوم کو مظلوم قوم کے خلاف جنگ آزما ہونے پر ابھارتا ہے وہی جذبہ کچھ دیر کے بعد جنون بن کر مظلوم قوم کو بھی اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس ظالم قوم کی غلامی کا جوا اپنی گردن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے آثار جھلکنے مظلومیت بذات خود ایک ایسا نفسیاتی احساس ہے جو سارے مظلوموں کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اور ایک ایجابی قوت و طاقت نہ سہی مگر انسانوں کے اندر مدافعت کی ہمت ضرور پیدا کرتا ہے۔ ایشیا کی بے شمار قومیں جو پچھلے چند سالوں میں یورپین استعمار کے چنگل سے یکے بعد دیگرے آزاد ہوئی ہیں اُن کی آزادی میں اگرچہ کسی حد تک عمل دخل دوسری جنگ عظیم کا بھی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی اقوام کے جارحانہ اقدام نے ہی مشرقی قوموں کے اندر آزادی کی تحریکات کو تیز کیا اور انہوں نے اپنے ممالک کو غیروں کی دستبرد سے بچانے کے لیے انتی اَن تھک اور زبردست جدوجہد کی کہ مغربی استعمار قوت و طاقت کے باوجود پسپا ہونے پر مجبور ہوا۔

---

مغربی استعماریت کچھ تو اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر جو انتہائی تلخ تھے اور کچھ حالات کے دباؤ سے اپنی ظاہری شکل و صورت تبدیل کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔ اب اس نے بالکل ایک نئے انداز سے مشرقی قوموں میں نفوذ کرنا شروع کیا ہے۔ دو سو سال کے واقعات نے ان قوموں پر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ دنیا کی کسی قوم کو قوت و طاقت کے بل بوتے پر زیادہ دیر تک غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ اس قسم کا جارحانہ طرزِ عمل لازمی طور پر ایک شدید ردِ عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جو بالآخر مظلوم قوم کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دلاتا ہے۔ پھر چونکہ یہ سارے مرحلے کشمکش اور لڑائی جھگڑے سے طے پاتے ہیں اس لیے ان کی تلخیاں بڑی حد تک انسانی حافظوں میں محفوظ رہتی ہیں اور غلامی کے جال سے نکلنے والی قوم کا ہر حساس اور ہوشمند فرد ایک مدت دراز تک اس ظالم قوم کے افعال و اعمال کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اُس کے اخلاص، اُس کی سوز مندی اور ہمدردی پر اُسے قطعاً اعتبار نہیں آتا اور وہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اُس کے اثر و نفوذ کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے ہر قدم پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اب مغربی قومیں اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے ایسے مہذب ذرائع استعمال کرنے لگی ہیں جن میں اس قسم کی تلخ صورتِ حال پیدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہونے پاتی بلکہ کمزور قومیں بڑی ہنسی خوشی اپنے سارے اسباب و وسائل ان استعماری طاقتوں کے قدموں میں لا ڈالتی ہیں۔

---

اس تبدیلی کی دوسری وجہ سائنس کی ایجادات و انکشافات ہیں۔ زمان و مکان پر انسان کی فتح نے ملکی اور جغرافیائی حد بندیوں کو بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ نظری حیثیت سے اگر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ قومیت کا تعلق اب خاکِ وطن سے کہیں زیادہ سیاسی گروہ بندیوں سے ہے۔ اس تصور کی بدولت جو اگرچہ سراسر مادی ہے، قومیت کا دائرہ وسیع ہوا ہے اور دنیا کی پوری آبادی مختلف تہذیبی اور ثقافتی منطقوں میں بٹ گئی ہے۔ ان منطقوں میں شامل ہونے والی قومیں اپنی نسلی اور لسانی انفرادیت کو تو کسی حد تک برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں مگر ان میں سیاسی اور معاشی تعاون عمل کی ایسی صورتیں نکالی جاتی ہیں کہ کمزور اقوام خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو طاقتور قوموں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ پہلے جو کچھ طاقتور گروہ لڑائی جھگڑے اور ظلم و زیادتی سے حاصل کرتے تھے اب وہ سب کچھ محبت، دوستی، رفاقت کے پردے میں کیا جاتا ہے۔ دنیا کی کمزور قومیں ان نئی استعماری طاقتوں کے ہاتھوں بالکل تباہ و برباد ہو جاتی ہیں مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی

---

اس استعمار کا دائرۂ عمل بھی پہلے استعمار سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ یہ جب کسی قوم میں راہ پاتا ہے تو اپنی ساری توجہ معاشی لوٹ کھسوٹ پر ہی صرف نہیں کرتا بلکہ اس قوم کے اخلاق، اس کے مذہب، اس کی معاشرتی روایات، اُس کے ادب، اُس کی تہذیب و ثقافت سب پر دستِ تطاول دراز کرتا ہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل بالکل فطری اور ناگزیر ہے۔ ایک قوم جو وطنی اور جغرافیائی حدود سے نکل کر ایک مخصوص تہذیب و تمدن کو اپنی قومیت کی اساس بناتی ہے۔ اس کو تباہ و برباد کرنے کی ممکن العمل صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ جن تہذیبی اور معاشرتی روایات نے اُسے ایک الگ قومی وجود بخشا ہے، انہیں یا تو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے یا انہیں اتنا کمزور بنا دیا جائے کہ ان میں لوگوں کو ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخصوص اجتماعی سانچے میں ڈھالنے کی قوت و طاقت باقی نہ رہے۔ دنیا کی جو طاقتور قوم بھی اس مقصد کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرے گی، انسانوں کی سربراہی اور امامت اُسی کے ہاتھ میں ہوگی۔ چنانچہ دیکھیے مغرب کے مختلف سیاسی بلاک اس کام کی تکمیل کے لیے کتنی بے جگری سے کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک لمبے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ طیاروں کے ذریعہ بم برسانے سے قومیں ختم نہیں ہوتیں، زہریلی ہواؤں کی مدد سے قوموں کی بصارت تو زائل کی جاسکتی ہے لیکن ان کی بصیرت زائل نہیں ہونے پاتی اس لیے انہیں برباد کرنے کا سب سے موثر ذریعہ یہی ہے کہ جن سہاروں سے ان کا قومی تشخص برقرار رہتا ہے ان کو ختم کرنے کی فکر کی جائے۔

---

مسلمان قومیں جو اس استعمار کی سب سے بڑی شکارگاہیں ہیں، وہاں ذرا دیکھیے، کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ کن کن عیاریوں اور چالبازیوں سے ان کی آئیڈیالوجی مٹائی جا رہی ہے۔ ان کے تہذیب و تمدن، اُن کی معاشرتی اور سیاسی روایات کو نیست و نابود کرنے کے لیے کس قسم کے "مہذبانہ" ہتھکنڈے استعمال ہو رہے ہیں۔ استعمار کی ان ریشہ دوانیوں کی داستان پہلی داستانوں سے کچھ کم دلفگار اور زہرہ گداز نہیں۔ البتہ ان میں صرف ایک فرق ضرور دکھائی دیتا ہے۔ پہلے استعمار نے اس قوم کے مال و متاع پر ہاتھ صاف کیا، اس کے ذہین اور عقلمند افراد کو یا تو قتل کیا یا پھر قید و بند میں ڈال دیا۔ لیکن اس نئے استعمار نے اب بدقسمتی سے اس کی سب سے قیمتی متاع یعنی دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنا شروع کیا ہے۔ کیونکہ یہ اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ اس قوم کا دین ہی اس کی زندگی کا مبداء اور اس کی اساس ہے اور اگر اسے برباد کر دیا جائے تو پھر اس قوم کی حیثیت اس دنیا میں ایک "زندہ لاش" سے زیادہ کچھ بھی نہ ہوگی۔ اسی دین سے یہ ملت نہ صرف زندگی کی حرارت حاصل کرتی ہے بلکہ اس کے اندر ہر قسم کی جارحیت کے خلاف مدافعت کا جو جذبہ ابھرتا رہتا ہے وہ بھی اسی ایمان کی کرشمہ سازی ہے۔ دین ہی اس کی سب سے بڑی قوت ہے اور اگر اس سے اس کا رشتہ منقطع ہو جائے تو پھر اس کے اندر کوئی طاقت بھی باقی نہیں رہتی۔

---

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس "بلند و بالا مقصد" کے حصول کے لیے جس قسم کی چالبازیوں سے کام لیا جا رہا ہے وہ اس استعمار کے خوفناک عزائم کی پوری طرح غمازی کر رہی ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی کوشش یہ ہے کہ اس قوم کے ذہین نوجوانوں کو "دین الحاد" قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے کیونکہ اگر ایک دفعہ یہ "فریب خوردہ شاہین" جال میں آ گئے تو پھر اس استعمار کے سامنے کوئی چیز بھی ٹھہرنے نہ پائے گی۔

اس نصب العین تک پہنچنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ بڑا ہی مؤثر اور نتیجہ خیز ہے یعنی اب اس قوم کی نوخیز نسلوں کو یہ نہیں کہا جاتا کہ تم اور تمہارے آباواجداد جس دین پر ایمان رکھتے ہیں وہ غلط ہے اس لیے تمہیں اسے ترک کر دینا چاہیے۔ یہ طریقہ تو بڑا پرانا اور غیر سائنٹیفک ہے۔ اس کے برعکس اب جو طریقہ ایجاد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی بڑی ہی مدح و ستائش کی جاتی ہے اور خصوصاً اس کے اُن حصوں سے بڑی ہی عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے جو بظاہر مغربی نظام تمدن میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر جمہوریت، مساوات اور حریتِ عقل۔ اس قسم کی مشترک بنیادوں کا فراہم کر لینا استعمار کی پہلی کامیابی ہے۔ یہ بنیادیں حجاب اور مغائرت کے اُن سارے پردوں کو چاک کر دیتی ہے جو دو ادیان کے ماننے والوں کے درمیان افکار و جذبات کا اختلاف حائل کرتا ہے۔ وہ ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے کو قبول کر لینے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے بلکہ "ارتداد" کا یہ دشوار گزار مرحلہ بڑی ہی آسانی اور بے تکلفی سے طے ہو جاتا ہے۔ آدمی اسلام جیسی نعمتِ غیر مترقبہ کو چھوڑ کر بڑی ہی خوشی کے ساتھ الحاد جیسی لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈالتا ہے مگر اُسے اس چیز کا قطعاً احساس نہیں ہونے پاتا کہ وہ ایک قعرِ مذلت میں گر رہا ہے۔ وہ اپنی اس حسرتناک تبدیلی کو خدمتِ دین و ایمان ہی سمجھتا رہتا ہے۔

---

پچھلے چند سالوں میں غیر مسلم مستشرقین نے اس قسم کی جتنی کوششیں کی ہیں اُن کی مثال پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ ان کو پڑھ کر انسان قدرتی طور پر یہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی یہ تعلیمات تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے ہاں موجود ہیں لیکن وہ آج سے پہلے ان لوگوں کے لئے کیوں وجہ جاذبیت نہیں بنیں اور اب ان میں وہ کونسی غیر معمولی خوبی پیدا ہو گئی ہے جس نے ان کے دل و دماغ کو یک لخت مفتوح کر لیا ہے۔ پھر اسلام اگر ان حضرات کے لیے اتنا ہی باعث کشش ہے تو آخر اسلام کے یہ فدائیان اس پر ایمان کیوں نہیں لے آتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام جمہوریت، مساوات اور عقل و فکر کی آزادی کا علمبردار ہے مگر ان تصورات کے پیچھے اُس کا اپنا ایک مخصوص تخیل کام کرتا ہے۔ اُس کی جمہوریت کا قصر عوام کی حاکمیت کی بجائے حاکمیت باری تعالیٰ کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح وہ قومی اخوت کی بجائے انسانی اخوت کا قائل ہے۔ اس کے ہاں حریتِ فکر سے بھی مراد یہ نہیں کہ انسان تمام قسم کی بندشوں سے اپنے ذہن کو آزاد کر لے۔ اس کی نظر میں حریتِ فکر کا یہ تصور ابلیس کی ایجاد ہے۔ وہ عقل و خرد کی جس آزادی کی تلقین کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن کو اُن ساری جکڑبندیوں سے آزاد کرے جن میں غیر اللہ کی اطاعت نے اُسے جکڑ رکھا ہے اور اپنے آپ کو صرف خدا کی اطاعت میں دے دے۔

ہمیں یہ ماننے میں سخت تامل ہے کہ ان مشترک بنیادوں کے پیچھے جو نظریاتی اختلاف کام کر رہا ہے اہلِ مغرب کا پڑھا لکھا طبقہ اُس سے ناواقف ہے۔ جن لوگوں نے عمر بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد ان بنیادوں کو فراہم کیا ہے وہ ان بنیادی حقائق سے کس طرح ناآشنا رہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان بنیادوں کو اس لیے ابھار ابھار کر سامنے لایا جاتا ہے کہ یہ وہ موزوں پوائنٹس (POINTS) ہیں جن پر سے امتِ مسلمہ کی فکر کی گاڑی کو الحاد و دہریت کی لائنوں پر منتقل کر دینا بہت سہل اور آسان ہے۔

---

علمی طور پر بھی اس دین سے مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لیے بےشمار طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ شریعتِ اسلامی کے مجموعی ڈھانچے میں سے نہایت عیاری کے ساتھ چند ایسی چیزوں کو منتخب کر لیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا ہے جو جدید تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ رواج کے خلاف پڑتی ہیں اور انہیں موضوعِ سخن بنا کر مسلمانوں کے دماغ کو پراگندہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اندر ان جاہلی تہذیبوں کے لیے محبت کا جذبہ بڑی حکمت و دانائی سے ابھارا جا رہا ہے تاکہ یہ لوگ اسلام کی بجائے ان تہذیبوں کو اپنا لیں جو اسلامی انقلاب سے پہلے مختلف اقوام میں رائج تھیں۔ اس کے علاوہ ان افراد، اداروں اور تنظیموں کی بھی پوری طرح پشت پناہی ہوتی ہے جو دین اور دینی اقدار کو ختم کرنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوں۔

---

یہ اور اسی قسم کی دوسری لاتعداد تدابیر کچھ ایسی نہیں جن سے ملتِ اسلامیہ ناواقف ہو۔ ہمارے ہاں کا ہر سوچنے اور سمجھنے والا فرد ان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ استعمار بڑی سرعت کے ساتھ ہمارے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے، مگر ہم ہیں کہ اس کی یلغار کو بڑے اطمینان کے ساتھ دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم تو خود آگے بڑھ کر اس کا استقبال کر رہے ہیں۔ یہی چیز اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس نے ہمارے فکر و نگاہ کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ ہم میں نہ صرف احساسِ زیاں باقی نہیں رہا بلکہ اس زیاں کو ہم اپنے حق میں انتہائی مفید اور کارآمد سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ آثار ہماری تباہی و بربادی کی سب سے بڑی علامت ہیں۔ جن کے نمودار ہونے پر ہماری نیندیں حرام ہو جانی چاہییں۔ اگر ہم اپنے آپ کو اور اپنی ملت کو اس استعمار کی یورش سے بچانے کے متمنی ہیں تو پھر اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ہم اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کریں جس پر نہ صرف ہماری اخروی نجات کا دارومدار ہے بلکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا انحصار بھی ہے۔ یہ دین ہی ہماری کامیابی کی واحد ضمانت ہے خواہ وہ آخرت کی کامیابی ہو یا اس دنیا کی۔

---

© rasailojaraid.com